فاطمہ مرنیسی

اسلام اور جمہوریت

ترجمہ: محمد ارشد رازی

مشعل

Mashal Books.org

فاطمہ مرنیسی

اسلام اور جمہوریت

ترجمہ: محمد ارشد رازی

مشعل بکس

آر بی 5 عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

MashalBooks.org

2

MashalBooks.org

3

اسلام اور جمہوریت

فاطمہ مرنیسی

ترجمہ: محمد ارشد رازی

کاپی رائٹ ©2002 مشعل بکس

کاپی رائٹ انگریزی © فاطمہ مرنیسی

مشعل بکس

آر بی 5 عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان

MashalBooks.org

فہرست

تعارف	اسلام اور جمہوریت	5
باب1	اجنبی مغرب کا خوف	17
باب2	امام کا خوف	28
باب3	جمہوریت کا خوف	51
باب 4	اقوام متحدہ کا چارٹر یعنی تاسیسی منشور	72
باب5	قرآن حکیم	87
باب6	حریتِ فکر کا خوف	96
باب 7	انفرادیت کا خوف	118
باب 8	ماضی کا خوف	130
باب9	حال کا خوف	147
باب10	عورتوں کا گیت......منزل آزادی	167
	نتیجہ :	
	سیمرغ ہم میں ہیں	193
	حواشی	196

MashalBooks.org

5

MashalBooks.org

تعارف

اسلام اور جمہوریت

خلیجی جنگ: خوف اور اس کی سرحدیں

جنگ خلیج ختم ہو چکی، فوجیوں کو اپنے اپنے اڈوں پر واپس پہنچے عرصہ گزر گیا، لیکن میرے جیسے بہت سے لوگوں کے لئے یہ جنگ ان چیزوں میں سے ایک ہے جن کی کوئی انتہا نہیں ہوتی......جیسے علامتی زخم اور لاعلاج بیماریاں۔ زندگی بہرطور رواں دواں ہے۔ موسم بہار میں خود کو گنگناتے، بالوں میں پھول اڑستے اور کسی نئی لپ اسٹک کا جائزہ لیتے پا کر آپ حیران رہ جاتی ہیں۔ زندگی اپنے تسلسل میں ہے، بظاہر یوں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھار کسی ناشناسا ملک میں نامانوس بستر پر، صبح دم کچی پکی نیند میں کسی چیز کے چٹخنے کی آواز آتی ہے اور کہیں اور سوتے اٹھتے خیالات و احساسات آپ کے شعور پر یلغار کر دیتے ہیں۔ تب آپ کو لگتا ہے کہ ایک انجانا خوف آپ کے اندر گویا گود دیا گیا ہے۔ ایک چرکا جو خراش سے گہرا نہیں لیکن اپنے انمٹ ہونے میں اتنا ہی شدید......اس لئے کہ یہ کہیں اس حصے میں گڑا ہے جہاں بچپن کے خوف ہوتے ہیں۔

اس طرح کی پہلی واردات کا آپ کسی سے کوئی ذکر نہیں کرتے.....قریب ترین دوستوں سے بھی نہیں۔ بس اسے بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاموش، خود پروان چڑھتی حساسیت میں گھرے کافی کی چسکیاں لیتے ہیں۔ یہ حساسیت ان لوگوں کا مقدر ہوتی ہے، جن کی زندگی بے اساس ہوتی ہے وہ خوابوں کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں، خصوصاً جلد محو ہو جانے والے خوابوں کے متعلق ۔ آپ بستر کو چھو کر اس کے حقیقی ہونے

Mashalbooks.org

کا تعین کرتے ہیں اور پھر کھڑکی میں کھڑے ہوکر شہر سے ایک تعلق پیدا کرنے کی کوشش میں گلیوں بازاروں کو ذہن نشین کرنے لگتے ہیں۔ تاہم گزرتے وقت کے ساتھ آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے جہاں گردی کم کر دی ہے تا کہ انجانی چیزوں سے بچ سکیں اور یوں بھی آپ کے لئے خواب یاد رکھنا بھی مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آپ امن اور چین کی آس میں یہ سب قبول کرتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ اگلا واقعہ نمودار ہوتا ہے اور آپ کا اپنا بستر نامانوس اجنبی علاقہ بن جاتا ہے۔

ساری دنیا میں اس جنگ کے خلاف بے دھڑک اور توانا ترین آواز خواتین اور خصوصاً عرب خواتین نے اٹھائی، جس کی جزئیات میں سے ایک یہ تھی کہ اس تنازعے کے دوران بے نقاب اور نقاب پوش ہر دو طبقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین نے امن کیلئے آواز اٹھانے میں پہل کی۔ لیکن اسے نظرانداز کر دیا گیا حالانکہ یہ بجائے خود ایک انقلابی اقدام کے مترادف تھا۔ عورتوں نے روایت کے برعکس سیاسی رہنماؤں......یعنی مردوں کی اجازت کا انتظار نہیں کیا۔ تونس، رباط اور الجزائر کی خواتین نے خوف و خدشات کے اظہار میں جو آواز اٹھائی، غالباً وہ بلند ترین تھی۔ خواتین نے دھرنوں اور مارچوں کے اہتمام میں مردوں پر تقریباً ہمیشہ سبقت لی۔ دوسری طرف مردوں نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بڑی طاقتوں اور چھوٹی طاقتوں سے مذاکرات کے کئی دور کئے جن میں کئی کئی بار کی ناکامی کے بعد کسی فیصلے پر پہنچا جا سکا۔ خود میں نے رباط میں منعقدہ کئی اجلاسوں میں شرکت کی اور درجنوں بار بغیر کسی التوا کے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے دانشور جنگ کے خلاف محاذ آرائی میں اکٹھے ہوئے۔ جب کبھی کسی غیر ملکی سفارت خانے کو تین چار پیراگراف پر مشتمل یادداشت پیش کرنے یا کسی سربراہ مملکت کو بیان دینے پر قائل کرنے کی تجویز منظور ہوئی، مجھ پر کھلا کہ بظاہر سیدھا سادہ یہ طرز اظہار دراصل قانونی اور سفارتی موشگافیوں کا ایک ناقابل یقین حد تک پیچیدہ سلسلہ ہے۔ یوں میں کئی بار سخت حیرت سے دوچار ہوئی، کیونکہ محض عورت ہونے کی وجہ سے اقتدار سے باہر رکھے جانے کے باعث مجھے ان پیچیدگیوں کی کبھی خبر نہ ہونے پاتی۔ لیکن عورت ہونے کے ناطے اپنے حصے کی اس محرومی کا مداوا یہ ہے کہ میری فکر بہت سی حدوں سے آزاد ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھ بے اختیاری کا ناقابل برداشت احساس بھی وابستہ ہے۔

عام حالات میں خاموش اور تابع فرمان عرب خواتین نے اس ختم نہ ہونے والی رات، یعنی جنگ، میں اپنے خدشات کی چیخ اتنی شدت سے کیوں بلند کی؟ انہیں تو سرکار قانونی طور پر کمتر گردانتی ہے! تو کیا انہیں جبلی طور پر احساس تھا کہ انسانی حقوق کے سب سے بڑے علمبردار یعنی اقوام متحدہ کی طرف سے جائز قرار دیئے گئے اور اس کی سرپرستی میں ہونے والے اس خون خرابے سے عرب قوتیں بے لگام ہو جائیں گی اور دوسروں کے قتل کو عین قانونی اور جائز خیال کرنے لگیں گی؟

کیا خواتین کی احتجاجی چیخ عیدالضحیٰ پر قربانی کے لئے تیار کھڑی بھیڑوں کی سی تھی اور انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی ریاستوں کے سربراہان اوراقوام متحدہ کے اعلیٰ ترین عہدیدار یعنی جمہوریت اور انسانی حقوق کے معبد کے سب سے بڑے پروہت نئی رسوم کی طرح ڈال رہے ہیں؟ ایسی رسوم کی طرح جو کہنگی اور تباہی میں پہلی تمام رسوم کو مات کر دیں گی اور ان کے ردعمل میں ایسی ہی روایات و رسوم قائم ادا ہوتی نظر آئیں گی۔

عرب معاشرہ حالت امن میں ہو تو عورتوں کا مقدر بڑی حد تک متعین اور دوسروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن غیر ملکی قوتوں کے ہاتھوں آگ اور خون میں دھکیل دیئے جانے کی صورت میں ان کا مقام بڑی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اگر بین الاقوامی قانون کے نام اوراقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے حکم پر جنگ عرب معاشرے پر مسلط کر دی جائے تو یہ سب عورتوں کے لئے کس درجہ خوفناک امکانات کا حامل ہوگا؟ اور جب یہ سب کچھ وہ مغربی طاقتیں کر رہی ہوں جنہیں دنیا کی اخلاقی رہنمائی کا دعویٰ بھی ہے، تو اس عمل کو کیا کہا جائے گا؟ یہی مغربی طاقتیں باقی ساری دنیا پر جمہوریت کا ایسا خاکہ مسلط کرنے پر مصر ہیں جس میں تشدد کسی طور جائز نہیں۔ کیا یہ جنگ ناگزیر تھی؟ کیا اس سے بچا نہیں جا سکتا تھا؟ یہاں یہی سوال زیرغور ہے۔

نسل در نسل چلنے والی حکومتیں مراتب کے طے شدہ نظام جمہوریت کی وعید کو اپنے لئے خطرہ کیوں خیال کرتے ہیں؟ افریقہ اور ایشیا میں جمہوریت حکومتوں کو غیر مستحکم کیوں کر دیتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جمہوریت ان معاشروں کی روایات کے اجزائے ترکیبی سے جا ٹکراتی ہے؟ یعنی تقدس کے لبادہ میں لپٹے تشدد سے متصادم ہوتی ہے۔

جب مغرب نے انسانی حقوق کی کسی بھی خلاف ورزی کو جرم قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی تو مدتوں نوآبادیاتی نظام کے جبر وتشدد کا شکار رہنے والی قوتیں بھی اسے قابل اعتماد رہنما خیال کرنے لگیں۔ جمہوریت تشدد اور اسے جائز قرار دیئے جانے کی راہ میں حائل دیوار ہے۔ اس لئے جمہوریت کو ریاستی اور ریاستوں کے مابین خونریزی سے عبارت عہد کے خاتمے کی نوید سمجھا جاتا ہے۔

تیسری دنیا کی یادداشت میں اہل مغرب ظالمانہ نوآبادیاتی نظام کے کار پردازوں کے طور پر ثبت ہیں۔ خیر کے علمبردار کی حیثیت سے انہیں اپنا سکہ جمانے میں جس قدر کامیابی دیوار برلن کے انہدام پر ملی، ماضی میں کبھی ممکن نہ ہوسکی تھی۔ اس ایک لمحے اور اس کے بعد مسلسل گرتی اقربا پرور جابر آمریتوں نے، جن میں سے چاؤ شسکو کا انجام خصوصاً عبرت انگیز تھا، ذرائع ابلاغ کے سہارے مدت سے جمود کے شکار عرب شہروں میں ایک امید افزاء ہلچل مچا دی۔ مجھے وہ جون یاد ہے جب پھیری والے مچھیرے نے کلو بھر مچھلی تھمائی اور مجھے کھڑا چھوڑ کر قریبی دکان کو دوڑ لگائی جہاں ٹی وی پر نکولائی اور ایلینا چاؤ شسکو کی گرفتاری پر رپورٹ چل رہی تھی۔ دس منٹ بعد لوٹا تو میں نے یوں کھڑا چھوڑ جانے پر خفگی کا اظہار کیا۔ اس کے جواب سے مجھ پر کھلا کہ یہ لمحہ اس کے لئے کیا معنی رکھتا ہے- وہ بولا: ''میرے پاس دو راستے تھے۔ آپ کو فارغ کرتا جس کے عوض مجھے چالیس درہم ملتے یا پھر قدرت خداوندی کا نظارہ کرتا۔ آپ خود ہی بتائیں ان دونوں میں کوئی مقابلہ ہے؟ چالیس درہم یا قدرت خداوندی؟ چالیس درہم کو کون پوچھتا؟ مادام، میں ان پڑھ ہوں لیکن آپ کی طرح، جو ممکن ہے تعلیمی اسناد سے لدی ہوں، مجھے بھی اتنا شعور ہے کہ تاریخ ایک موڑ پر کھڑی ہے۔''

دیوار برلن کا ٹوٹنا اور مشرقی یورپ میں جابرانہ حکمرانوں، اداروں اور اِن حکومتوں کی علامتوں کا انہدام جغرافیائی اور نسلی اعتبار سے مقامی ہونے کے باوجود اپنے معانی میں عالمگیر تھا۔ یہ بجا ہے کہ دیوار برلن کا ٹوٹنا صرف اہل یورپ، بلکہ زیادہ درست معنوں میں اہل جرمنی کا، معاملہ تھا۔ ہم نے جرمنوں کو اس دیوار پر چڑھتے، اس کے گرنے پر خوشیاں مناتے، اس کے ٹکڑے کرتے اور پھر ان ٹکڑوں کو جواہرات کی طرح گلے میں حمائل کرتے دیکھا تھا؛ وہ ٹکڑے جو مٹتی سرحدوں اور کٹے پھٹے حجاب (پردہ ، نقاب) کی باقیات

تھیں۔اگرکوئی عرب بچہ 'آہنی پردے، کے ترجمے کی کوشش کرے تو وہ لفظ ''حجاب'' پر قدرے لڑکھڑائے گا اور اس کا جواب ہوگا، ''الحجاب الحدیدی'' ۔اور وہ بچہ بالکل درست ہوگا کیونکہ لفظ ''پردے'(Curtain) کا ترجمہ کسی ایسی چیز کے طور پر ہی ہوسکتا ہے جو مکان کو ایسے دوحصوں میں بانٹ دے جن کے درمیان اشیاء کی نقل وحرکت ممکن نہ رہے۔ یوں پردے کا ترجمہ ''حجاب'' عین درست مفہوم ادا کرتا ہے۔شمالی افریقہ کے شہروں میں جوتوں کی رکھوالی کرنے والوں سے لے کر دور دراز کے پہاڑی سلسلوں میں بسنے والے دہقان تک بھورے بالوں والے ان نوجوان لڑکوں لڑکیوں کی قومیت بتا سکتے تھے جوگاتے ناچتے باہم گلے ملتے، نشہ آزادی میں چور اور آمریت کوختم کرنے کی آرزو لئے دیوار برلن گرا رہے تھے۔''حجاب برلن'' کے یوں پھٹ گرنے پر دنیائے عرب کے شہروں میں ایک اورلفظ جو بہت مشہور ہوا، شفافیت(Transparency) تھا۔

ہرطرح کے اختیارات سے محروم، فیصلوں سے بے دخل اور اپنے ممالک کی بے ڈھب سیاست کی سی پارہ پارہ زندگی گزارنے والے عرب نوجوان لڑکوں لڑکیوں میں اچانک شمال کے ان لوگوں میں دلچسپی بیدار ہوئی جوگلیوں بازاروں میں آزادی اور انصاف کے حصول کی خاطر نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔ اس وقت تک ان کے ذہن میں جرمنی کا خاکہ فقط ایک ایسے ملک کا تھا جہاں ڈوئچئے مارک کے استحکام کی برکت سے لوگ غریبوں کی قسمت پر بسورنے کی بجائے ہمہ وقت حصول مسرت میں مگن رہتے ہیں اور اب وہ ان جرمنوں کو دیکھ رہے تھے جن میں انصاف اور آزادی کی طلب نے زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ عرب نوجوان نسل کو جرمنوں کا یہ رگ و ریشے میں بسا جذبہ، اتنا بنیادی اور شناسا لگا کہ بے اختیار احساس محرومی میں اپنے اکیلے ہونے کا احساس جاتا رہا۔ وہ بے اختیار پکار اٹھے، ''واللہ'' یہ جرمن بھی ہماری طرح محسوس کرتے ہیں، اپنے نسبتاً غریب بھائیوں سے محبت کرتے ہیں اور انہیں آزاد کروا رہے ہیں۔'' رباط شہر میں جوتوں کی مارکیٹ سوق السبت کے ایک دکاندارعلی نے اپنی حیرت کا اظہار انہی الفاظ میں کیا تھا۔ دیوار برلن گرنے کے تین دن بعد اپنی دکان میں رکھنے کو اس نے ایک بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن خرید لیا تھا۔ یورپ جو1969ء کی انسانیت نوازی کی لہر کے بعد عیش کوشی اور آزادہ روی کے باعث، ہمارے نزدیک بےحسی کا شکار ہوگیا تھا،اچانک جذبات میں جلنے لگا۔عرب ٹیلی ویژن پر ایسا یورپ

نمودار ہوا جس کی توقع نہیں کی جا رہی تھی۔ ''کافر اور انسان دوست! اللہ اکبر'' ایک آنکھ ٹی وی اور دوسری جوتوں پر جمائے علی نے منہ ہی منہ میں کہا:

''حجاب، برلن'' کے ٹوٹنے کے بعد اور بغداد پر حملے سے ذرا پہلے تک کے زمانے میں عرب عوام اہل یورپ کو عقیدہ جمہوریت کے معمار، مبلغ اور محافظ کی حیثیت سے دیکھنے لگے تھے؛ جمہوریت جس کے حتمی نتیجے کے طور پر تشدد کا مسئلہ کم ہوتے ہوتے بالآخر حل ہو جائے گا۔ اس کا استعمال بھی کم کم ہونے لگا۔ لیکن پھر اس جنگ نے تشدد کی مذمت، عدم تشدد کے وعدوں اور اہل یورپ کے نغمات سے عالمگیر سطح پر اٹھنے والی امید کی توانا لہر کو بے رحمی سے برابر کر دیا۔ چند ماہ کی اس جنگ کے دوران اظہار رائے سے محروم عرب شہریوں کو لگا گویا الف لیلیٰ کی کہانی میں آنے والے کسی ڈرامائی موڑ کی طرح، یورپی انسان دوست نسل کو گہری نیند سلا دیا گیا ہے۔ اب ان کے ٹیلی ویژن پر جو چہرے نظر آتے تھے وہ ایک اور ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے جسے وہ تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ ہو بہو نوآبادیاتی دور کے سے۔ کیپی (فوجی ٹوپی بمعہ چشمہ) لگائے، تمغوں سے آراستہ جنرل جو بڑے فخر سے بغداد پر گرائے جانے والے بموں کی ٹنوں میں گنتی بتا رہے تھے۔ بم باری شروع ہونے کے دو ہفتے بعد علی نے اپنا ٹی وی فروخت کر دیا اور حاصل ہونے والی رقم مراکشی ہلال احمر کو دے آیا۔

''استاذہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ مقابلہ بڑی طاقتوں کے درمیان ہے۔ یہ معاملہ انہیں آپس میں طے کرنا چاہیے۔ بغداد کے جوتا فروش اس میں شامل نہیں ہیں۔ لوگوں پر بم کیوں گریں؟ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ سوق السبت پر ایک بم گرایا جائے تو کیا ہوگا؟ محض ایک پٹاخہ پورے شہر کو آگ میں جھونک دے گا۔ میں چھیالیس برس کا ہوں۔ کیپی میں فرانسیسی جنرل آخری بار دیکھا تو دس برس کا تھا: اس وقت 1955ء میں جب آزادی ملا ہی چاہتی تھی۔ لیکن کیل کانٹے سے لیس یہ امریکی!......سب امریکی فلموں کا سا لگتا ہے۔ بس ایک فرق ہے کہ ان کا نشانہ ہمارے اپنے بھائی ہیں۔ مجھے ڈراؤنے خواب آنے لگے ہیں۔ میری بیوی مجھے ٹی وی دیکھنے سے منع کرتی ہے۔''

تشدد بجائے خود خلاف تہذیب ہے لیکن اگر اس کا نشانہ بننے والے کو کچھ لمحے پہلے ایسے افعال قبیحہ سے پاک عہد کی نوید سنا دی جائے تو اس کی شدت اتنی زیادہ ہوگی کہ انسانی

MashalBooks.org

ذہن اس کا احاطہ نہ کر پائے گا- تشدد کے حوالے سے اہل یورپ کی اس بے رخی نے عوام الناس کو ذہنی پراگندگی اور انتشار سے دوچار کر دیا ہے۔

خلیج کی جنگ اس بحث کو کیفیتی حوالے سے ماضی میں بہت دور لے گئی ہے۔ چنانچہ مجھے اپنے احساس کی وضاحت کے لئے نسلی گروہی اصطلاحات استعمال کرنا ہوں گی۔ لگتا ہے کہ بحیرہ روم کے بالمقابل ساحلوں پر دو متحارب قبائل خیمہ زن ہیں۔ آج سے قبل شمال میں اپنے ساتھیوں کو ان کے یورپین اور خود کو اپنے عرب ہونے میں کبھی اتنا منجمد نہیں پایا۔ ہم میں سے کوئی ایک تو بہرحال دقیانوسی تھا کہ اختلافات کم نہ کئے جا سکے۔ میں نے دوران جنگ مکالمہ کیلئے فضا سازگار ہونے کی امید میں، جرمنی اور فرانس میں ہونے ودالے مباحثوں اور مکالموں میں شرکت کی اور میرا مذکورہ بالا خیال پختہ تر ہوگیا۔ کیونکہ یہ سارا عمل لاحاصل رہا۔ فقط اتنا ثابت ہوا کہ ہم میں باہم حائل درمیانی دیوار گرانے کی اہلیت موجود نہیں اور نہ یہ صلاحیت کہ ایک دوسرے سے ملیں اور اس ایقان کے ساتھ کہ اختلاف خوف و خدشے کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ جب تک اختلاف کو دھمکی خیال کیا جاتا رہے گا حد بندیاں ہی قانون بنی رہیں گی۔

ایک حرم میں پیدا ہونے کی وجہ سے بہت کم عمر میں ہی جبلی سطح پر میں جان گئی تھی کہ ہر حد بندی کے دوسری طرف کچھ نہ کچھ پوشیدہ ہے اور وہ خالی از خطر نہیں۔ مجھے اس کتاب میں اسی خوف و خدشہ بلکہ خدشات پر کچھ کہنا ہے۔ ہر طرح کے خوف کے متعلق جو ہر سمت سے، باطن اور خارج سے، مشرق اور مغرب سے پھٹ پڑتے ہیں اور پھر عکس در عکس باہم ضرب کھاتے لامحدود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انفرادی خدشات پر بھی بات ہوگی لیکن زیادہ تر اجتماعی خدشات زیر بحث آئیں گے۔ ان میں سے اول الذکر کا نتیجہ خودکشی کی صورت نکلتا ہے جو بالآخر ایک انفرادی معاملہ ہے۔ لیکن موخرالذکر کا نتیجہ فتنہ یعنی تشدد کے پھٹ پڑنے کی صورت نمودار ہوتا ہے اور اپنی ہلاکت آفرینی میں شدید ترین ہے، کیونکہ اس کا مقام وقوع ایک گروہ کا داخلی علاقہ ہے۔

میرے گروہ میں یہ حد بندیاں قانون کی صورت ٹھوس شکل میں ہیں۔ بحیرہ روم کے جس طرف میں رہتی ہوں، یہ حد بندیاں ''حدود'' کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ ''حدود'' ایسا معین اور یقینی حصار ہے جو خطرے کی صورت پناہ کی ضمانت ہے: جس طرح کے حصار

ہمارے اجداد نے شہروں کے گرد تعمیر کئے تھے۔لیکن جنگ خلیج نے ثابت کر دیا کہ یہ حدود کم از کم جب تک عربوں کے ہاتھ میں ہیں، بے مقصد ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ ایک عرب عورت اپنے گروہ کے اندر اپنا مسئلہ، اپنے حجاب کا مسئلہ، اٹھانے پر کیونکر اصرار کر سکتی ہے؟ اگر اس عورت کا قبیلہ بغداد کو بموں کا ہدف بنالینے والی دنیا میں خود کو غیر محفوظ اور آسان شکار خیال کرنے لگے، عورت گروہ کے اندر صفوں کی نئی حد بندیوں پر بات چیت کے موقف پر کیونکر اڑ سکتی ہے؟

دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) میں بغداد کی بنیاد رکھی گئی تو یہ شہر مدینۃ السلام (شہر امن) کہلاتا اور زمین پر جنت کی یاد دلاتا تھا، جسے قرآن میں دارلسلام کا نام دیا گیا ہے۔ یہ نام اسے شہر کے بانی دوسرے عباسی خلیفہ المنصور نے دیا تھا۔منصور نے یہ نام اپنے سکوں، وزنوں اور خطوں پر بھی استعمال کیا۔شہر کو ناقابل شکست بنانے کے خیال سے معماروں نے اسے مدور شکل میں تعمیر کیا تھا۔ کیا انہیں علم تھا کہ ان سے قبل جنوبی عرب میں صابئیوں نے سیاست کا ایک معبد دائروی شکل میں تیار کیا تھا۔ حصاروں یعنی ''حدود'' کا تصور المنصور کی جنت میں بھی موجود تھا۔ بنیادی طور پر المنصور نے یہ حصار دفاعی نقطہ نظر سے تعمیر کروائے تھے لیکن اس کے پیش نظر یہ واحد مقصد نہیں تھا۔ المنصور کے نزدیک بھی ایک مثالی منظم مسلم آبادی کی بنیاد حصاروں کے وجود کو تسلیم کر لینے پر تھی جو اختلافات کی شناخت اور پھر انہیں بے لگام ہونے سے روکنے میں معاونت کریں۔ اپنے تحفظ کو ہر ممکن حد تک یقینی بنانے کی غرض سے المنصور نے 157ھ/773ء میں حکم دیا کہ منڈی شہر سے باہر منتقل کر دی جائے تا کہ ناشکرے اور شرانگیز عوام الناس کو محل سے دور رکھا جا سکے۔ زمین پر جنت کا تصور منصور کے ذہن میں اسی طرح کا تھا۔

کیا تب سے معاملات میں کچھ تبدیلی آئی ہے؟ بارہ صدیوں کے بعد بھی ہم اپنی جو چھوٹی سے جنت روزانہ تعمیر کرتے ہیں کیا وہ مدینۃ السلام کے نمونے پر نہیں ہوتی؟ ہم میں سے کون ایسے شہر امن کا تصور کر سکتا ہے جو حصاروں، حدود فاصل، دیواروں، حجابوں اور ''حدود'' سے خالی ہو؟ ہم میں سے کون ہے جو بغیر حصاروں کے خود کو محفوظ خیال کرے۔ اس کے باوجود جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ بغداد سمیت دنیائے عرب کا سارے شہر ہمیں ہمارے تخیل کے حصاروں کے سوا کوئی حصار فراہم نہیں کر سکتے۔ ہمارے شہروں کے

MashalBooks.org

گرد سے حصار نوچ لئے گئے ہیں اور ''حدود'' کے بغیر کوئی کیسے جیئے گا۔ ایسے کرہ ارض پر کسی کو احساس تحفظ کہاں نصیب ہوسکتا ہے جہاں بقول مسٹر بش ''آزادی کے تحفظ'' کے نام پر اعلیٰ درجہ کی تکنیکی مہارت اور معیار کے حامل تشدد کو کسی بھی وقت ظہور میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ نظام جتنا مہلک ہے اتنا ہی تیز رفتار بھی ہے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ گھر جسے تحفظ حاصل نہ ہو، عربی میں ''عریاں'' کہلاتا ہے، اس عورت کی طرح جو حجاب کے بغیر ہے۔ (القرآن 33/13)۔

بغیر حجاب، بے نقاب گلیوں میں گھومتی عورت کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ''حدود'' سے باہر اور معیارات و مسلمات سے ماورا ہونے کی کوشش میں ہے۔ اسے غیر محفوظ خیال کیا جاتا ہے۔ محض اس لئے نہیں کہ اس نے حرم کو، جو دراندازی سے محفوظ ممنوعہ علاقہ ہے، چھوڑا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس نے ایسے علاقہ میں آنے کی جسارت کی ہے جو اس کا نہیں ہے۔ ایک اور لفظ جسے واعظین اپنے خطبوں میں مرد و زن کے اختلاط سے مسلم شہر کو لاحق خطرات کی وضاحت میں برتتے ہیں، تبرج ہے۔ یہ لفظ بھی عسکری ذخیرہ الفاظ سے لیا گیا ہے – یہ لفظ ''برج'' سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ''گڑھی'' یا ''مورچہ'' ہے۔ لغت کے مطابق اسے یہ نام ''بلند اور فاصلے سے نظر آنے'' کے باعث دیا گیا ہے۔

ایک خود آگاہ عورت کا بے نقاب باہر نکل آنا جارحانہ عمل ہے۔ یعنی کھلے چہرے آزادانہ گھومنا دوسروں کے سامنے اپنی نمائش کرنا ہے اور یہ ترغیب کی وہ قسم ہے جس کے خلاف مردوں کے پاس کوئی دفاع نہیں ہے۔

شادی شدہ لوگوں کے لئے عربی میں ایک لفظ ''محصن'' موجود ہے، یعنی ''محفوظ لوگ''۔ یہ لوگ جنسی ترغیب سے محفوظ ہیں کیونکہ یہ ایک دوسرے کی جنسی تشفی کے ضامن ہیں۔ ''محصن'' قانونی تصور ہے اور شادی شدہ لوگوں کے زنا کاری جیسے تنازعات میں استعمال ہوتا ہے۔ اور شادی شدہ لوگوں کے لئے ناجائز جنسی تعلقات کی سزا زیادہ سخت مقرر کی گئی ہے۔ شادی شدہ مرد و زن کو جنسی ترغیب سے مامون کیا گیا ہے۔ ''محصنہ'' کو جنسی ترغیب سے یہ حفاظت اس تشفی کی صورت میسر ہے جو اسے شوہر فراہم کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک شہر کی حفاظت ''حصن'' (فصیل، شہر پناہ) کرتی ہے۔ اسے اپنے طالب اور خواہش مند مردوں کے خلاف فقط جسمانی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ترغیب سے بھی

MashalBooks.org